سنت کے بارے میں امام ابوحنیفہ کا موقف

(۲)

(سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو ترجمان ذی القعدہ ۱۳۵۷ھ)

اقسام حدیث میں سے متواتر اور مشہور کے بارے میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک گذشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے۔ ذیل میں خبر واحد کے بارے میں اُن کے موقف کی وضاحت کی گئی ہے۔

خبر واحد کی تعریف خبر واحد ـــــ یا امام شافعی رحمہ اللہ اور ان کے ہم عصر فقہا کی اصطلاح میں "خبر خاصہ" اُس حدیث کو کہتے ہیں جس کے راوی ایک یا دو یا دو سے زائد ہوں اور اُس میں مشہور حدیث کی شرائط میں سے کوئی شرط نہ پائی جاتی ہو۔ خبر واحد کی سند کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ہونا ظن غالب کی بنا پر ہوتا ہے نہ کہ یقینی علم کی بنا پر، جیسا کہ اوپر متواتر اور مشہور کی بحث میں گذر چکا ہے۔ اسی لیے علمائے فقہ خبر واحد کے بارے میں یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ اس کی سند کا اتصال کے ساتھ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچنا قطعیت کے ساتھ ثابت نہیں ہوتا ہے۔ کشف الاسرار کے مصنف نے لکھا ہے کہ خبر واحد کے اتصال میں ظاہری اور معنوی دونوں پہلوؤں سے اشتباہ کی گنجائش موجود ہے۔ ظاہری لحاظ سے اشتباہ کا احتمال اس بنا پر ہوتا ہے کہ جس قطعیت کے ساتھ متواتر اور مشہور حدیث کا سلسلۂ اسناد آں حضورؐ تک پہونچتا ہے خبر واحد کے بارے میں ویسی قطعیت اور صحت کا ثبوت فراہم نہیں ہوتا۔ معنوی طور پر اس احتمال کی دلیل یہ ہے کہ خبر واحد کو امت کے اندر قبولیت عامہ کا وہ شرف حاصل نہیں ہوا جو متواتر اور مشہور کو حاصل ہے .....

خبر واحد میں رُواۃ کی تعداد کا بھی کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ جب تک وہ تواتر اور شہرت کے درجے سے فروتر ہے اور اُن کی شرائط و علامات سے خالی ہے وہ بہرحال خبر واحد ہی شمار ہوگی، خواہ اس کے راویوں کی تعداد

ایک سے زائد ہو.........."[1]

دورِ اجتہاد میں خبرِ واحد کے منکرین

عہد صحابہ اور عہد تابعین کے بعد جب تبع تابعین کا دور آیا جسے ہم دورِ اجتہاد کے نام سے یاد کرتے ہیں، تو بعض ایسے لوگ بھی نمودار ہوئے جنہوں نے خبرِ واحد کو دین میں حجت اور ماخذ شریعت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ان لوگوں کے انکار کی بنیاد دراصل اُسی مذکورہ بالا شبہ پر قائم تھی جو خبرِ واحد کے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ہونے میں کسی نہ کسی حد تک پایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ دو اور اسباب بھی ایسے تھے جنہوں نے ان کے انکار و جحود کو مزید تقویت پہونچائی۔ اُن میں سے پہلا سبب یہ تھا کہ اُس وقت وضعِ حدیث کا فتنہ نہایت زور پکڑ چکا تھا۔ اور فتنہ جو عناصر کثرت کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹی اور خود ساختہ احادیث منسوب کر رہے تھے (جس سے حدیث کے بارے میں لوگوں میں شکوک و شبہات پیدا ہو رہے تھے) اور دوسرا سبب یہ تھا کہ احادیث کا ذخیرہ ابھی تک خلط ملط تھا۔ صحیح اور غیر صحیح احادیث میں تحقیق و تمیز اور چھان بین کا کام ابھی باقاعدہ طور پر شروع نہیں ہوا تھا۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے "جماع العلم" میں لکھا ہے کہ یہ لوگ (خبر واحد کے منکرین) بصرہ میں رہتے تھے اور ان لوگوں کے ساتھ اُن کے مناظرے بھی ہوئے ہیں۔ بصرہ شروع ہی سے نہ صرف معتزلہ کا گڑھ تھا بلکہ دوسرے مختلف مذاہب کے پیروں اور مختلف فرقوں کی بھی آماج گاہ بنا ہوا تھا، جہاں مناظروں اور مجادلوں کا ہر وقت بازار گرم رہتا تھا۔ اس لیے لازماً خبرِ واحد کے منکرین امام شافعی رحمہ اللہ سے پہلے یعنی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں بھی وہاں موجود ہوں گے۔ اس قیاس کو اس سے بھی تقویت ملتی ہے کہ احادیث میں شکوک و شبہات کے جو اسباب امام شافعی رحمہ اللہ کے زمانے میں پائے جاتے تھے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے زمانے میں اس سے زیادہ کثرت اور شدت کے ساتھ موجود تھے۔ اس وقت تک صحیح احادیث کو غیر صحیح احادیث سے ممیز کرنے کا کوئی کام نہیں ہوا تھا۔ ذاتِ رسول پر افترا پردازی اور جھوٹی روایات کا انتساب وسیع پیمانے پر ہو رہا تھا۔ اقوال و روایات میں اختلاف و اضطراب شدت کے ساتھ پایا جاتا تھا اور اس پر مستزاد یہ کہ احادیث کے نقد و جرح کے ضوابط، جو بعد میں علماء حدیث نے

[1] کشف الاسرار۔ از امام فخر الاسلام بزدوی ص ۹۹

مدوّن کیے، اُس وقت تک وضع نہیں کیے گئے تھے اور نہ ہی صحیح احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب ہوا تھا۔ ایک طرف تو یہ ابتدائی امور بھی طے نہیں پائے تھے اور دوسری طرف یہ حالت تھی کہ ہوا پرست رنگا رنگ کے بھیس بدل کر اور گوناگوں مذاہب کا لبادہ اوڑھ کر فتنہ پردازیاں کر رہے تھے اور ہر گروہ اپنی دُھن میں مست اور اپنے مسلک میں مگن ہو کر میدان میں اُترا ہوا تھا (كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۝) اس خلفشار اور غوغا آرائی میں امت کی پناہ گاہ صرف فقہاء اور محدثین کا طبقہ تھا اور جمہور مسلمین کو اپنی نجات اور اطمینان و سکون کا سامان اگر کہیں میسر آسکتا تھا تو انہی حضرات کے توسط سے آسکتا تھا اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ فقہاء و محدثین ہی کی جاں فشانیاں تھیں جو اس تیرہ و تار شب میں حق کو باطل سے چھان پھٹک کر امت کے لیے روشنی مہیا کر رہی تھیں۔

خبر واحد عملی احکام کا ماخذ ہے اسی انتشار اور کثرتِ اتہام طرازی کو مدنظر رکھ کر جمہور فقہاء نے یہ رائے قائم کی کہ عقائد و ایمانیات کے بجائے اُسے صرف عملی احکام کا ماخذ بنایا جائے اور عقائد و ایمانیات کے استثنیٰ کی وجہ یہ ٹھیرائی گئی کہ دین کے اس حصے کی بنیاد ایسے دلائل و براہین پر رکھی جاسکتی ہے جو ہر لحاظ سے یقینی اور قطعی الصحت ہوں اور ان میں کسی پہلو سے غلطی اور اشتباہ کا دخل نہ ہو۔ عقیدہ کہتے ہی اُس یقینی علم کو ہیں جو ٹھوس قطعی اور یقینی دلائل سے پیدا ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس طرح کا حتمی علم ایسی دلیل سے ہرگز حاصل نہیں ہوسکتا جس میں شک و شبہ کی آمیزش ہو یا اس کی قطعیت کسی طور سے بھی مجروح ہوتی ہو۔ اب رہا یہ سوال کہ عملی پہلو کے لیے اس قطعیت اور تیقن کو کیوں لازم نہیں قرار دیا جاتا، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عمل کا دار و مدار خبر (روایت) میں صدق و کذب کے دو مساوی پہلوؤں میں سے جانبِ صدق کی طرف رجحان پر ہوتا ہے۔ صدق کی جانب ترجیحِ محض کے لیے صرف یہی کافی ہوتا ہے کہ اگر خبر میں کسی مخالف دلیل سے احتمالِ کذب پیدا ہو رہا ہو تو اُس کی نفی ہو جائے۔ مطلق احتمال کی نفی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پھر اگر راوی (خبر دینے والا) عادل اور ثقہ ہو تو وہ خبر کی صحت اور صداقت کے پہلو کو اُس کی عدم صحت و صداقت کے پہلو پر غالب و فائق کر دیتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ اگر ایک طرف منفی پہلو سے احتمالِ کذب پیدا کرنے والی کوئی مخالفانہ دلیل نہ ہو اور دوسری طرف مثبت طور پر راوی کی عدالت و ثقاہت احتمالِ صدق کی تائید و تقویت کر رہی ہو تو ایسی صورت میں خبر کو قبول کیا

خبر واحد کو صرف ثقہ اور عادل راویوں سے قبول کیا جائے اور

جاتا ہے اور اس کے مقتضیات پر عمل درآمد کیا جاتا ہے۔ یہ ضابطہ صرف روایتِ حدیث ہی سے مختص نہیں بلکہ یہ انسانی فطرت کا ایک عمومی تقاضا بھی ہے۔ عامۃ الناس اپنے باہمی نزاعات کے تصفیہ میں، لین دین کے روزانہ کے معاملات میں اور زندگی کے عام کاروبار و مشاغل میں طبعًا اسی اصول پر چلتے ہیں۔ اگر زندگی کے عام معاملات و مسائل کی استواری شکوک و شبہات سے مبرا اور یقینی دلائل کے ساتھ مشروط کر دی جائے اور کوئی کام یا کوئی کلام اُس وقت تک صحیح نہ تسلیم کیا جائے جب تک اُس کی صحت کے لیے ناقابلِ اشتباہ اور قطعی ثبوت فراہم نہ ہو تو اس طرح انسانی زندگی کی گاڑی کا ایک دن کے لیے بھی چلنا محال ہو جائے گا، تمام کاروبار ٹھپ ہو جائیں گے اور کسی غلط چیز کا ازالہ ہو سکے گا نہ کسی صحیح چیز کا اثبات ممکن رہے گا۔

امام ابوحنیفہؒ خبرِ واحد کو تسلیم کرتے تھے

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اُن فقہا کی صفِ اول میں پائے جاتے ہیں جنہوں نے خبرِ واحد کو قبول کیا ہے۔ شریعت کے احکام و مسائل میں اُسے سند و حجت تصور کیا ہے اور اپنے قیاس اور رائے پر اُسے مقدم و مرجح ٹھیرایا ہے۔ امام موصوف کا یہ طریقہ تھا کہ انہیں اگر کوئی ایسی حدیث مل جاتی جو اُن کے قائم کردہ قیاس سے متصادم ہوتی تو بلا تامل قیاس سے دست بردار ہو جاتے اور مقتضائے حدیث پر عمل کرتے۔ ہم پیچھے کسی باب میں بیان کر چکے ہیں کہ امام صاحب کو جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فتویٰ معلوم ہوا کہ غلام کا کسی محارب کافر کو امان دینا آزاد کے امان دینے کے حکم میں ہے تو انہوں نے اپنی پہلی رائے سے (جو خلیفہ ثانی کے فتوے کے خلاف پڑتی تھی) رجوع کر لیا۔ اور فتویٰ کو اپنے مسلک کا ماخذ قرار دے لیا۔ جب ایک صحابی کے فتوی کی اہمیت و فوقیت اُن کی نگاہ میں اس قدر تھی کہ طریقِ آحاد سے مروی ہونے کے باوجود، وہ اُسے بے دریغ قبول کر لیتے تھے اور اس کے مقابلے میں اپنے قیاس کو ساقط کر دیتے تھے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سندِ آحاد سے مروی ہونے والی احادیثِ نبوی کو وہ کس قدر بدرجۂ اولیٰ قبول کرتے ہوں گے! چنانچہ اُن کے اخذ بالحدیث اور عمل بالحدیث کے ثبوت میں بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں، مگر یہاں اُن کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ امام ابو یوسف کی کتاب (الآثار) اور امام محمد کی کتاب الآثار اٹھا کر دیکھ لیں۔ ان دونوں کتابوں پر ایک طائرانہ نگاہ ہی سے آپ جان جائیں گے کہ امام ابوحنیفہ کس درجہ مستعدی اور دلی آمادگی سے خبرِ واحد کو تسلیم کرتے تھے، اُسے رسولؐ تک روایت کرتے تھے، اپنے فقہ و اجتہاد کا

ماخذ و مبنیٰ ٹھیراتے تھے، اس کے احکام کو مسائل کی عِلَل کا استخراج کرتے تھے، اور قیاس کی موزونیت و استواری اور مصلحت عامہ کے ہم آہنگ رہنے کی حد تک اُن پر نئے مسائل کا استنباط کرتے تھے۔ ان تمام تفصیلات کو معلوم کرنے کے لیے مذکورۃ الصدر دونوں کتابوں کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ جہاں تک ان کتابوں کی صاحبین کی طرف نسبت کا تعلق ہے، اس کی صحت میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہ کے تلامذہ کا مسلک چونکہ امام صاحب خبر واحد کے بارے میں اپنے موقف کو ہمیشہ شاگردوں کے سامنے واضح کرتے رہتے تھے، اس لیے آپ کے شاگردوں کا بھی وہی مسلک رہا ہے جو آپ کا ہے۔ امام محمد رحمہ اللہ، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے جلیل القدر شاگرد، ان کے مذہب کے صحیح ترجمان اور حنفی مدرسۂ فکر کی حقیقی تصویر کشی کرنے والے ہیں۔ فقہ حنفی کے قواعد و ضوابط سے جو شخص بھی واقفیت اور لگاؤ رکھتا ہے وہ مذہب حنفی میں ان کے مقام کو بخوبی پہچانتا ہے۔ امام محمد نے اپنی کتاب "الاصل" میں صحیح آثار و اقوال سے شرح و بسط کے ساتھ ایسے دلائل پیش کیے ہیں جن سے خبر واحد کی حجیت کا اثبات ہوتا ہے۔ اسی طرح انہوں نے احادیث رسول اور آثار صحابہ سے بے شمار واقعات نقل کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ خود صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا طرز عمل بھی یہی تھا کہ وہ خبر واحد کو تسلیم کرتے تھے اور اس کے مطابق عمل کرتے تھے۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے اس فعل (قبول روایت اور اسے معمول بہ بنانے) کی تغلیط کرنے کے بجائے اُسے برقرار رکھتے تھے۔ آپ کی وفات کے بعد بھی صحابہ کا یہی شیوہ رہا۔ اُن میں سے کوئی ایسا نہ تھا جس نے منفرد راوی کی روایت کو تسلیم کرنے میں چون و چرا کی ہو۔ اتنی بات ضرور تھی کہ بعض صحابہ کبھی کبھی احتیاط کے پیش نظر ایک راوی کی دوسرے شخص سے تصدیق و توثیق کروا لیتے تھے، یا اصل راوی سے حلف لے کر اپنا وثوق اور اعتماد حاصل کر لیتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ انہیں قبول روایت میں پس و پیش تھا یا اس میں شک و شبہ ہوتا تھا بلکہ اُن کا یہ طریقہ محض اطمینان اور احتیاط کے پہلو سے تھا۔ امام محمد رحمہ اللہ نے "الاصل" میں استحسان کے باب میں ایسے تمام واقعات کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔

خبرِ واحد کے بارے میں صحابہ کا طرزِ عمل

ذیل میں ہم آپ کے سامنے "الاصل" کے بعض اقتباسات نقل کرتے ہیں۔ جو اس امر کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہیں کہ فقہ حنفی میں اخبارِ آحاد پر کہاں تک اور کس حد تک اعتماد اور تمسک کیا جاتا ہے۔

۱۔ امام محمد نے دادی کی توریث کے بارے میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی حدیث[۱] کو بیان کیا ہے کہ مغیرہ بن شعبہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سامنے شہادت دی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کو سُدس (چھٹے حصہ) کا حق دار بنایا ہے۔ خلیفۂ اول نے پوچھا کہ کوئی اور بھی اس کا شاہد ہے؟ چنانچہ محمد بن مسلمہ نے بھی اس کی تائید کی۔ تب حضرت ابوبکر نے اسے نافذ کر دیا۔ یہ خالص دین کا معاملہ تھا۔ حضرت ابوبکر نے اس میں خبرِ واحد کی بنیاد پر اپنا فیصلہ صادر کیا ہے۔ دوسرے راوی کو بطور شاہد طلب کرنا صرف مزید توثیق و تائید کے لیے تھا۔

۲۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے پاس ابوموسیٰ اشعری نے حدیث[۲]

---

[۱] پوری روایت یوں ہے کہ ایک بار ایک متوفی کی دادی ابوبکر الصدیق کے پاس آئی کہ اسے بھی ورثہ میں سے کچھ ملنا چاہیے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "کتاب اللہ میں تیرا حصہ مقرر نہیں کیا گیا اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حصے کے بارے میں کچھ ارشاد فرمایا ہے یا نہیں؟" پھر حضرت ابوبکر نے دوسرے لوگوں سے پوچھا کہ "کیا تم میں سے کسی نے رسولِ خدا کو دادی کے حقِ وراثت کے بارے میں کچھ فرماتے سُنا ہے؟" مغیرہ بن شعبہؓ نے کہا: "رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کو میت کے ترکہ میں سے چھٹے حصہ کا حق دار بنایا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے دریافت کیا کہ کوئی اور بھی اس کا شاہد ہے؟" محمد بن سلمہؓ نے بھی یہی شہادت دی۔ یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ نے اس عورت کو پوتے کے مال میں سے چھٹا حصہ دے دیا۔ [۲] جریری نے نضرہ سے اور انہوں نے حضرت ابوسعید سے روایت کیا ہے کہ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دروازے کے باہر انہیں تین بار (بلانے کے لیے) السلام کہا، لیکن جب آپ نے کچھ جواب نہ دیا تو واپس لوٹ آئے۔ حضرت عمرؓ نے آدمی بھیج کر ابوموسیٰ کو بلوایا اور لوٹ جانے کی وجہ پوچھی۔ حضرت ابوموسیٰ نے کہا کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سُنا ہے کہ: "اذا استأذن احدکم فلم یؤذن لہ فلیرجع"۔ حضرت عمرؓ نے کہا: "اس پر کوئی اور گواہ پیش کرو، ورنہ تمہاری خیر نہیں"۔ راوی کہتا ہے کہ ابوموسیٰؓ گھبراہٹ کے عالم میں ہمارے پاس آئے

بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "جب تم میں سے کوئی دروازے پر تین آوازیں دے اور اس کے باوجود اُسے اجازت نہ ملے تو واپس چلا آئے"۔ حضرت عمرؓ نے سن کر فرمایا: اس پر کوئی گواہ لاؤ"! چنانچہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت کی توثیق کی۔

امام محمد ان دونوں روایتوں کی نسبت حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے طلب شہادت کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شیخین کا دوسرے راوی کو شہادت کے لیے طلب کرنا محض تثبت اور احتیاط کی خاطر تھا ورنہ ان کے لیے ایک راوی کا بیان ہی کافی تھا۔

۳۔ امور دین میں خبر واحد کو قبول کرنے کے ثبوت میں امام محمد نے حضرت عمرؓ کے ایک اور عمل سے استدلال کیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ عورت کو اپنے شوہر کی دیت میں وارث نہیں سمجھتے تھے لیکن جب ان کو ضحاک بن سفیان رضی اللہ عنہ نے یہ خبر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن (ضحاک) کو لکھا تھا کہ "اشیم الضبابی کی بیوی اُس کی دیت میں وارث ہے"۔ تو حضرت عمرؓ نے ضحاکؓ کی روایت کو قبول کرلیا اور اپنی سابقہ رائے سے رجوع کرلیا۔

۴۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک عمل سے بھی مثال ملتی ہے۔ آپؐ نے دحیہ کلبیؓ کے ہاتھ قیصر روم کو خط بھیجا جس میں آپؐ نے قیصر روم کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ امام محمد لکھتے ہیں کہ یہ خط قیصر روم پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اتمام حجت کی حیثیت رکھتا تھا۔ (حالانکہ اسے لے کر جانے والا (دحیہ کلبیؓ) فرد واحد تھا)۔ اسی ضمن میں امام محمد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے جس میں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ قبول حدیث کے بارے میں اپنے طرز عمل کو بیان کرتے ہیں کہ: جب میں کسی حدیث کو براہ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنتا تھا بلکہ کوئی دوسرا شخص میرے سامنے آپؐ کی حدیث بیان کرتا تو میں اس سے حلف لیتا تھا۔ حضرت ابوبکر نے مجھ سے حدیث بیان کی اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ان کے چہرے کا رنگ متغیر تھا۔ ہم نے پوچھا: کیا معاملہ درپیش ہے؟ انہوں نے پورا واقعہ بتایا۔ اور کہا کہ تم میں سے کسی نے اس حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے؟ ہم نے کہا ہم میں سے ہر ایک نے سنا ہے" پھر ایک صحابی اُن کے ساتھ گئے اور حضرت عمرؓ کو اس حدیث کی خبر دی۔ (مسلم)

انہوں نے جو کچھ فرمایا ٹھیک فرمایا۔ (اُن سے حلف لینے کی ضرورت نہیں)۔ امام محمد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یہ قول نقل کرنے کے بعد "مسئلہ یمین" کی تشریح کرتے ہیں اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ حلف لینے کے معاملے میں دوسرے تمام صحابہ سے منفرد تھے۔ حضرت علی کی عام عادت تھی کہ گواہ سے بھی حلف لیتے۔ مدعی سے بھی ثبوت کے ساتھ حلف لیتے۔ اپنی اسی عادت کی بنا پر حدیث بیان کرنے والے سے بھی حلف مانگا کرتے تھے۔ آپ کے اس مسلک سے یہ نتیجہ ماخوذ ہوتا ہے کہ گویا آپ اس امر کے قائل تھے کہ راوی جب کسی حدیث کو روایت کرتا ہے اور اس کے ساتھ اپنا حلفیہ بیان بھی دے دیتا ہے تو اس کی روایت مُزَکّٰی (کذب و غلطی کی آلائش سے پاک) ہو جاتی ہے۔ اس کی صورت بعینہٖ وہی ہوتی ہے جو لعان کے مسئلے میں فریقین (عورت اور شوہر) کی طرف سے شہادتیں ادا کرنے کی ہوتی ہے جو مُخبر معصوم من الکذب نہیں ہے (اور انبیاء کے علاوہ کوئی انسان کذب سے معصوم نہیں ہے) انفرادی حیثیت میں اس کی خبر اُس وقت تک حجیت کے مقام پر نہیں پہنچ سکتی جب تک کہ وہ حلف کے ذریعہ روایت کو تہمتِ کذب کے شائبہ سے نہیں دھو دیتا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر اس شرط کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ وہ قسم دینے سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فداہ ابی و امی کی بارگاہِ اقدس سے حضرت ابوبکر کا الصدیق کے لقب سے نوازا جانا اس امر کے لیے کافی ہے کہ اُن کی روایت و خبر مُزَکّٰی اور آلائشِ کذب کے احتمال سے پاک ہے۔

اس قبیل کے اقوال و آثار کا معتدبہ ذخیرہ امام محمد نے اپنے دعوی کے اثبات میں نقل کیا ہے، جس میں سے چند آثار بطور نمونہ ہم نے آپ کے سامنے بیان کر دیے ہیں۔ امام محمد نے ان دلائل و شواہد سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ خبرِ واحد امورِ دین میں مقبول و مسلّم ہے۔ رویتِ ہلال کے سلسلے میں شخصِ واحد کی خبر پر اکتفا کیا جا سکتا ہے۔ کسی شے کے بارے میں تحلیل و تحریم کا فیصلہ منفرد شخص کی اطلاع کے بموجب کیا جا سکتا ہے چنانچہ فقہ حنفی میں یہ امور مسلّمات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ امام صاحب کی طرف سے اسی فقہی نظریے کا شاگردوں کو املا کرانا منقول ہے۔ اور اس پر امام صاحب کے اصحاب اور تلامذہ کی موافقت و ہم آہنگی کی شہادت بھی موجود ہے۔ اب غور کیجیے کہ جب امام صاحب کے مسلک میں تحلیل و تحریم جیسے دین کے اہم مسائل میں عام انسانوں کی منفرد خبر اور روایت کو درجۂ قبولیت حاصل ہے تو یہ بات عقل و فہم سے بالاتر ہے

کہ وہ اپنے استنباط و اجتہاد کے مقابلہ میں خبر واحد کو غیر مقبول اور ناقابلِ تسلیم گردانتے ہوں گے (اور اُسے مسترد کر کے اپنے قیاسی مسائل پر جمے رہتے ہوں گے) خصوصاً جب کہ اُس کی سند بھی ایک ہی واسطے پر نہیں بلکہ متعدد واسطوں پر مشتمل ہو۔!!

فقہ حنفی کے فروعات اور کلیات سے صاف مستنبط ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے احادیثِ آحاد کو بھی شرعی مآخذ کی فہرست میں رکھا ہے۔ اور اپنے فقہی قیاسات اور اجتہادی قواعد و ضوابط کی تدوین میں اُن پر استناد کیا ہے۔ اس سلسلے میں جمہور فقہا اور محدثین کی طرح حنفیہ کے ہاں بھی روایت و قبولیتِ حدیث کے شرائط معین ہیں۔ چنانچہ خود امام صاحب اور ان کے اصحاب اور بعد کے فقہائے حنفیہ نے راوی کے لیے عدالت اور ضبط (حفظ) کو شرطِ لازم قرار دیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ حفظ کے مفہوم کی تعیین اور تشریح میں حنفیہ دوسروں کی نسبت زیادہ تشدد کا پہلو اختیار کرتے ہیں۔ امام فخر الاسلام بزدوی نے کشف الاسرار میں مسلکِ حنفی کے مطابق ضبط کی تشریح یہ کی ہے:-

مسلکِ حنفی کے مطابق ضبط کی تعریف

ضبط کی تعریف یہ ہے کہ راوی حدیث کو اپنے کانوں سے — پورے انہماک کے ساتھ — سنے، اُس کی مراد و منشا کو سمجھے، محنت اور کوشش سے اُسے یاد رکھے اور پھر روایت کرنے کے وقت تک تمام عرصہ میں اپنے حفظ اور یادداشت کے بارے میں خوش فہمی کا شکار ہوئے بغیر بار بار اہل علم سے مذاکرہ کرتا رہے۔ ضبط کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) متنِ حدیث کے الفاظ و کلمات کو اور اس کے لغوی معنی کو محفوظ رکھنا۔ (۲) اس کے ساتھ ساتھ حدیث کے شرعی اور فقہی منشا ... کو یاد رکھنا۔ (یعنی یہ شعور رکھنا کہ قانونی احکام اور فقہی مسائل حدیث سے کیسے مستنبط کیے جا سکتے ہیں اور حدیث کا موقع و محل کیا تھا) ضبط کی دوسری قسم پہلی سے زیادہ جامع اور اکمل ہے۔ مطلق اور عام ضبط کا اطلاق پہلی قسم پر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس راوی پر پیدائشی طور نسیان و ذہول کا غلبہ ہو یا روایت کے بیان کرنے میں بے احتیاطی اور ظن و تخمین کا عادی ہو اس کی روایت قابل حجت نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ اس کے اندر ضبط کی وہ شرائط مفقود ہیں جو قسم اول میں بیان کی گئی ہیں۔ اسی طرح فقیہ راوی کی روایت جب غیر فقیہ راوی سے متعارض ہو جائے گی .....

. . . . . تو اول الذکر کی روایت کو موخر الذکر کی روایت پر ترجیح دی جائے گی۔ (اس بنا پر کہ اول الذکر راوی میں ضبط کی زیادہ کامل اور جامع شرائط موجود ہیں) [1]

اصول بزدوی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ حنفیہ ضبط کی تعریف و تشریح میں تشدد اور غلو کی طرف مائل ہیں اور اُن کے نزدیک ضبط کا مفہوم اُس وقت کامل و جامع ہوتا ہے جب کہ راوی میں تفقہ کی صفت بھی پائی جاتی ہو۔ لیکن یہ بھی اضح ہے کہ وہ راوی کے تفقہ کو ترجیح روایت کی اساس تو قرار دیتے ہیں مگر اُسے قبولِ روایت کی شرط نہیں ٹھیراتے۔ مثلاً جب دو (سند کے اعتبار سے ہم پلہ حدیثیں) باہم متعارض ہوں ان میں سے ایک کا راوی فقیہ ہو۔ اور دوسری غیر فقیہ راوی سے پہونچ رہی ہو تو احناف کے نزدیک (ضبط کامل کی شرائط سے متصف) پہلے شخص کی روایت مقدم و مرجح اور واجب العمل ہوگی۔ تفقہ کو اساس ترجیح شمار کرنے کا سبب یہ ہے کہ جو راوی سرمایۂ تفقہ سے بہرہ ور ہوتا ہے وہ ضبط حدیث میں اور تحقیق و تجسس میں دوسروں سے فائق ہوتا ہے اور دین کے فہم و تدبر میں بھی وہ دوسروں پر سبقت لے جاتا ہے

ترجیح فقیہ کے باب میں امام صاحب کی تصریح راوی کے تفقہ کی بنیاد پر روایت کو ترجیح دینے کی تصریح خود امام ابوحنیفہ کی اپنی زبان سے منقول ہے، جو کہ امام صاحب نے امام اوزاعی رحمہ اللہ کے ساتھ اپنی ایک مناظرانہ گفتگو میں کی ہے۔ اس مناظرے کی پوری روداد کو حضرت سفیان بن عیینہؒ نے روایت کیا ہے کہ "ایک بار امام ابوحنیفہ اور امام اوزاعی کی دارالخیاطین، مکہ میں ملاقات ہوئی۔ اثنائے گفتگو امام اوزاعی نے امام ابوحنیفہ سے پوچھا:

"تم (اہلِ عراق) رکوع میں جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع یدین کیوں نہیں کرتے؟

امام ابوحنیفہ نے جواب دیا:

"کیونکہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے کہ آپؐ تکبیرِ اُولیٰ کے علاوہ رکوع جاتے اور رکوع سے اٹھنے کے وقت بھی رفع یدین کیا کرتے تھے"

اوزاعی نے کہا:

کیوں کر ثابت نہیں ہے۔ مجھ سے زہری نے، زہری سے سالم نے اور سالم نے اپنے باپ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز شروع فرماتے

اور جب رکوع کرتے اور رکوع سے سر اٹھاتے تو رفع یدین فرماتے۔"

امام ابوحنیفہ نے جواب دیا:

ہم سے حماد نے، حماد سے ابراہیم نے، ابراہیم سے علقمہ اور اسود نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سند سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف نماز شروع فرمانے کے وقت ہاتھ اٹھاتے تھے۔ اس کے بعد رکوع وغیرہ میں ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔

امام اوزاعی نے کہا:

میں آپ کے سامنے زہری، سالم اور عبداللہ بن عمرؓ کی سند سے روایت بیان کر رہا ہوں اور آپ اس کے مقابلے میں حماد اور ابراہیم کا نام لیتے ہیں۔"

امام ابوحنیفہ نے کہا:

"حماد زہری سے زیادہ اور ابراہیم سالم سے زیادہ فقیہ ہیں۔ عبداللہ بن عمرؓ کو اگرچہ صحبتِ رسول کا شرف حاصل ہے تاہم علقمہ اُن سے کم نہیں ہیں۔ اسود کو بھی بہت سی فضیلتیں حاصل ہیں۔"

ایک دوسری روایت میں آخر کے الفاظ یوں ہیں کہ "ابراہیم سالم سے زیادہ فقیہ ہیں اور اگر صحبتِ رسول کی فضیلت کا سوال نہ ہوتا (جو عبداللہ بن عمرؓ کو حاصل ہے) تو میں کہتا کہ علقمہ کا درجۂ فقاہت عبداللہ بن عمر سے اونچا ہے رہے عبداللہ بن مسعود تو وہ عبداللہ بن مسعود ہی ہیں[1]۔ یعنی ان کے مرتبہ تک مذکورہ اصحاب میں سے کسی کی رسائی نہیں۔

اس مناظرے سے یہ امر صاف واضح ہوتا ہے کہ امام صاحب ایک روایت کو دوسری روایت پر ترجیح دیتے وقت راوی کے تفقہ اور اجتہادی معیار کو ملحوظ رکھتے تھے اور درجۂ کم فقیہ کی روایت ترک کر کے زیادہ فقیہ کی روایت کو اختیار کرتے تھے۔ اس ترجیح کی وجہ ظاہر ہے کہ جو راوی تفقہ میں جس قدر زیادہ بہرہ رکھتا ہوگا وہ اسی قدر یادداشت اور ضبط میں زیادہ پختہ اور فہم و ادراک میں

[1] حجۃ اللہ البالغۃ از امام شاہ ولی اللہ دہلوی جلد اول ص ۳۳۱

زیادہ کامل ہوگا۔

دوسری بات جو امام اوزاعی اور امام ابوحنیفہ کی گفتگو سے متبادر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر فقیہ انہی محدثین کی حمایت کرتا تھا جن کا شاگرد ہوتا تھا اور جن سے روایت کرتا تھا۔ یہ چیز علاقائی عصبیت کی پیداوار تھی۔ یا دوسرے ہلکے لفظوں میں اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہر علاقے کے علماء انہی احادیث کو لیتے تھے جن کے رُواۃ اُس علاقے کے صحابہ کے شاگرد ہوتے تھے۔

امام صاحب کے نکتہ چینوں کو شمس الائمہ سرخسی کا جواب

شمس الائمہ سرخسی نے امام ابوحنیفہ کے قلتِ روایت کی یہ توجیہ کی ہے کہ امام صاحب ایک تو راوی کے ضبط و حفظ کی شرط میں انتہائی سختی کرتے تھے اور اس بنا پر بہت کم روایات اُن کے معیار پر اُترتی تھیں۔ اور دوسرے وہ تقلیلِ روایت میں سلف کے نقشِ قدم پر چلتے تھے کیونکہ ان کی اکثریت بھی قلیل الروایت ہی تھی۔ شمس الائمہ لکھتے ہیں کہ: "ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے بہت کم احادیث مروی ہیں۔ حتیٰ کہ بعض نکتہ چینوں کو یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ امام صاحب حدیث سے ناآشنا تھے۔ ان لوگوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ امام صاحب اپنے زمانہ کے سب سے بڑے عالمِ حدیث تھے۔ چونکہ وہ راوی میں کمالِ ضبط کی شرط کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھتے تھے اس لیے اُن کی طرف سے بہت کم احادیث منقول ہیں[1]"۔ بہرحال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امام صاحب خبرِ آحاد کو قبول کرتے تھے، بلکہ اُس کے قبول کرنے میں انہیں کسی طرح کا تردد نہ ہوتا، البتہ راوی کے ضبط میں متشدد تھے۔ جیسا کہ خود فقہائے حنفیہ کا بھی خیال ہے — اور جب مختلف روایات میں تعارض ہو جاتا تو رُواۃ کے تفقہ اور اجتہادی صلاحیت کو دیکھتے۔ جو راوی محض روایت گو ہوتا اس پر فقیہ راوی کو ترجیح دیتے۔ اور اگر دونوں راوی فقیہانہ صلاحیتوں سے بہرہ ور ہوتے تو اُن میں سے جو نسبتہً زیادہ فقیہ ہوتا اُس کی روایت کو مقدم گردانتے۔

(باقی)

[1] کشف الاسرار جلد دوم ص ۳۱۸